(۱۹۰۶............۱۹۸۱ء)

فضل احمد کریم فضلی

فضل احمد کریم فضلی ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے پاس کیا۔ آئی سی ایس آفیسر رہے۔ فلم سازی کی صنعت سے بھی وابستہ رہے۔ کئی فلموں کے لیے گیت لکھے۔ ۷۵ سال کی عمر میں ۱۷ دسمبر ۱۹۸۱ء کو کراچی میں فوت ہوئے۔

فضل احمد کریم فضلی اردو ادب کی نہایت معتبر شخصیت تھے۔ ان کی اصل حیثیت تو ناول نگار کی ہے لیکن انھوں نے شاعری خصوصاً غزل میں ہیئت اور مواد کے کئی نئے تجربے کیے ہیں۔ اُن کے فن میں جو سادگی، بے ساختگی پائی جاتی ہے اس کی وجہ ان کا تنقیدی شعور ہے۔ وہ اپنی تخلیق کو ہر زاویے سے پرکھتے ہیں۔ وہ لکھنے میں بڑی محنت کرتے ہیں۔ جس کتاب نے انھیں لازوال شہرت عطا کی وہ ان کا ناول ''خونِ جگر ہونے تک'' ہے جسے انھوں نے ایک دفعہ لکھ کر ضائع کیا یہی ناول جب انھوں نے تیس سال بعد لکھا تو ایک عظیم فن پارہ وجود میں آیا۔ یہ ناول پھر بے حد پسند کیا گیا اور اس کے مختلف زبانوں میں تراجم ہوئے۔

فضل احمد کریم کردار نگاری پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کردار ماحول سے ضرور متاثر ہوتے ہیں لیکن خود ان میں ماحول کو متاثر کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہوتی ہے۔

فضل احمد کریم کے ہاں عوامی زندگی اور انسانی قدروں کا بھرپور احساس پایا جاتا ہے۔ اسلام سے گہری عقیدت کا اظہار ان کی زندگی میں عام پایا جاتا ہے۔ ان کے ناولوں میں واقعات کا تسلسل اور اسلوب بیان میں ایجاز و اختصار نے واقعات کو نہایت مؤثر بنا دیا ہے۔ زبان بامحاورہ اور روزمرہ کے عین مطابق ہے اور الفاظ نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ اعلیٰ درجے کی انشاپردازی اور شعریت نے ان کا علمی و ادبی مرتبہ خاصا بلند کر دیا ہے۔

تصانیف:

خونِ جگر ہونے تک (ناول)، سحر ہونے تک (ناول)، سحر ہونے کے بعد (ناول)، نغمۂ زندگی اور چشمِ غزل (مجموعہ کلام)۔

(فضل احمد کریم فضلی)

خونِ جگر ہونے تک

مخلص کے چلے جانے کے بعد جمعدار صاحب بڑی الجھن میں پڑ گئے۔ کبھی اُٹھتے کبھی بیٹھتے کبھی چت لیٹ جاتے، لیکن الجھن میں کوئی کمی نہ ہوئی، آخر ان سے نہ رہا گیا اور باوجود نقاہت کے وہ مولانا مستنصر باللہ کے پاس اُٹھ کے جانے لگے، بیوی جان نے کہا "کہاں جارہے ہو؟" بولے "کہیں نہیں، ابھی آتے ہیں"۔

"سنا ہے گیدو کی ماں بیمار ہے، اس کے پاس کچھ کھانے کو نہیں، کچھ بھجوادو"۔

جمعدار صاحب کھسیا کے بولے۔ "یہاں ہم خود مررہے ہیں تمھیں گیدو کی ماں ہی کی پڑی ہے۔" اور باہر چلے گئے۔ دیکھا مولانا مستنصر باللہ کے پاس ایک نورانی صورت کے بزرگ تشریف فرما ہیں اور مولانا بڑے ادب سے ہاتھ باندھے، نگاہیں نیچی کیے بیٹھے ہیں، جمعدار صاحب نے ان بزرگ کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، مگر سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو کوئی بہت پہنچے ہوئے آدمی ہیں۔ لہٰذا بہت زیادہ مؤدب ہو کے بیٹھ گئے، مولانا نے اپنے پیر صاحب سے اُن کا تعارف کرایا، جمعدار صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ مولانا کے مرشد ہیں تو وہ سراپا عجز و نیاز بن گئے اور جب یہ معلوم ہوا کہ وہ جون پور کے ہیں تو بے اختیار قدم چومنے کے لیے بڑھے۔ مگر پیر صاحب نے روک دیا۔ جمعدار صاحب اپنی جگہ پر واپس چلے گئے اور پہلے سے بھی زیادہ مؤدب ہو گئے، سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہیں بڑی کوشش کے بعد ذہن میں ایک جملہ ترتیب دے پائے اور ڈرتے ڈرتے بولے "حضور کا مزاج تو اللہ کا فضل ہے"

پیر صاحب "خدا کا شکر ہے، آپ کا مزاج کیسا ہے، آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں"۔

پیر صاحب کے جواب نے جمعدار صاحب کو موقعہ دیا، ذرا رک کے بولے "جی حضور، میں ذرا پریشان.......... آپ سے ایک بات پوچھنا مانگتے ہیں..........

"فرمایئے"۔ "جُلو دھر.......... مولانا صاحب جانتا ہے.......... کافر ہے.......... اس سے بھی ایک برا چیز ہوتا ہے..........

وہ ہے، وہ مخلص کو بھی اپنی طرح بنالیا ہے۔ آج دونوں آکے میرے.......... صاحبزادے.......... ابوالبرکات

کیا.......... اس کو بہت بخار تھا۔ سر پر پانی رکھا.......... مگر کوئی ہمارا مسلمان بھائی ایسا نہیں کیا.......... کاہے؟

پیر صاحب "انھوں نے اچھا کام کیا، مسلمانوں کا سا.......... مسلمان بھائیوں نے بُرا کیا مسلمانوں کی شان کے خلاف"

جمعدار صاحب، "مگر حضور.......... وہ لوگ تو بولتا ہے.......... رُوح کچھ نہیں.......... گناہ ثواب کچھ نہیں۔ نعوذ باللہ.......... اللہ

بھی کچھ نہیں...... اور پھر بھی اچھا کام کرتا ہے اور ہم...... ہم لوگ سب کچھ مانتا ہے پھر اچھا کام نہیں کرتا۔"

پیر صاحب "استغفر اللہ۔ مگر آپ کا اس سے مطلب کیا ہے"۔ "مطلب کچھ نہیں......... بس...... میں پریشان ہیں"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں، غور سے دیکھیے تو ہم میں ان میں فرق کیا ہے، ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ خدا کو مانتے ہیں لیکن کیا واقعی ایسا ہے؟ اگر ہم سچ مچ خدا کو مانتے تو یہ سمجھتے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ سب خدا دیکھتا ہے، اس لیے کوئی بات ایسی نہ کریں جو اس کے حکم یا مرضی کے خلاف ہو بلکہ ایسی باتیں کریں جس سے وہ خوش ہو، ہم جو ایسا نہیں کرتے تو اس کے یہی معنی ہوئے نا کہ ہم زبان سے چاہے کچھ کہیں لیکن دل سے یہ نہیں سمجھتے کہ کوئی ہمارا پیدا کرنے والا اور مارنے والا بھی ہے، جس کے آگے ہمیں ایک دن اپنے اعمال کا جواب دینا ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ یا تو ہم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں یا منافقت کر رہے ہیں، تو جہاں تک خدا کو ماننے نہ ماننے کا تعلق ہے ہم میں ان میں کوئی خاص فرق نہیں"۔

جمعدار صاحب بڑے غور سے سنتے رہے، پیر صاحب کا ایک ایک حرف ان کے دل میں اُترا جا رہا تھا، اب جمعدار صاحب کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جلو دھر اور مخلص ان سے اچھے انسان ہیں، کم سے کم منافقت تو نہیں کرتے، ان کو اپنی گذشتہ زندگی مکر و فریب کا ایک سراب نظر آنے لگی، ان پر ایک مبہم سا خوف طاری ہونے لگا، پسینہ چھوٹنے لگا۔ رونگٹے کھڑے ہونے لگے، اپنی حالت کو وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں صرف "جی حضور" کہہ کے ظاہر کر سکے، دوسرے لفظ نہ ان کے خیال میں آئے نہ زبان پر۔

پیر صاحب "ایک بات یہ بھی ہے کہ جو لوگ زبان سے اقرار کرتے رہتے ہیں ان کے لیے ایک دن دل سے بھی اقرار کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔۔ اب رہا نیک کام کرنے کا سوال، تو وہ آدمی طبیعت کے تقاضے سے بھی کر سکتا ہے یا کسی مقصد کے لیے، جلو دھر اور مخلص کے پاس ایک مقصد ہے، اپنی پارٹی کے اثر کو بڑھانا اپنے خیالات کو پھیلانا، جب مسلمانوں کے پاس بھی ایک مقصد تھا جو جلو دھر اور مخلص کی پارٹی کے مقصد سے کہیں بڑا تھا تو اس وقت کی اور ہی بات تھی، انھوں نے جیسے جیسے بڑے کام کیے اور جیسے جیسے بڑے لوگ پیدا کیے ویسے دنیا کی کسی اور قوم نے اب تک نہیں کیے۔ دور کیوں جائیں یہی دیکھیے کہ یہاں بنگال میں کتنے مسلمان ہیں، اتنے کہ دنیا میں کہیں اور نہیں۔ آخر انھیں کس نے مسلمان بنایا۔ یہ ہمارے ان بزرگوں کا کام ہے جو گھر بار چھوڑ کر سیکڑوں ہزاروں میل کا سفر طے کر کے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا کے یہاں محض خدا کا نام پھیلانے کے لیے آئے، ان بزرگوں میں سوائے چند ایک کے کسی کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ کیا یہ لوگ ذاتی نام و نمود کے لیے کام کرتے تھے؟ نہیں، بلکہ خدا کی خوشنودی کے لیے، یہی سچے مسلمان کی شان تھی"۔ جمعدار صاحب حیرت سے پیر صاحب کی طرف دیکھتے رہے، ان کی ڈھارس بندھ رہی تھی۔ طوفان چھٹ رہا تھا۔ بادِ مراد چلنے لگی تھی۔

پیر صاحب تھوڑی دیر خاموش رہے لیکن ان کی نگاہیں جمعدار صاحب پر گڑی رہیں پھر اُنھوں نے ایک خاص توجہ سے دیکھ

کے کہا۔ ''اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمانوں میں کچھ خدا کے بندے ایسے مل جائیں گے جن سے اچھے انسان کسی اور قوم میں نہ ملیں گے۔ اگر چاہیں تو آپ خود ویسے ہی ہو سکتے ہیں''۔

جمعدار صاحب کے دل و دماغ کی ڈوبتی ہوئی کشتی ابھر آئی۔ جیسے کسی نے مضبوط ہاتھوں سے کھینچ کر اسے کنارے پر لگا دیا ہو۔ باوجود جسمانی ضعف اور نقاہت کے انھیں روح میں ایک توانائی محسوس ہونے لگی اور اس توانائی میں ایک خاص قسم کی لذت۔ وہ اب تک تو تھے کراہتے اور لڑکھڑاتے لیکن اُٹھے سپاہیانہ انداز سے، پہلے نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اب اٹھی ہوئی، پہلے زمین دوز تھیں اب فلک شگاف۔ جمعدار صاحب مضبوط قدموں اور مسکراتے چہرے کے ساتھ لوٹے۔ سامنے موتی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے پاس کچھ کھانے کو ڈالنا تھا۔ جمعدار صاحب خود اپنے ہاتھ سے پوال اُٹھا کے لائے، قیص نے دیکھا تو دوڑا، جمعدار صاحب نے بڑی نرمی سے کہا ''قیص بچہ تمھاری طبیعت اچھی نہیں ہے، ابھی آرام کرو''۔ قیص کو جمعدار صاحب کے لہجے اور طرزِ عمل میں کچھ نئی بات معلوم ہوئی جسے وہ سمجھ نہ سکا، جمعدار صاحب گھر میں داخل ہو کے سیدھے بی بی جان کے پاس گئے۔ دیکھا انھیں بدستور بخار ہے۔ انھیں یکا یک گیدو کی ماں کا خیال آیا، بی بی جان سے بولے ''ارے سُنتی ہو، تم گیدو کی ماں کو کچھ بھیجنے کو کہہ رہی تھیں''۔

''کہہ تو رہی تھی مگر تم نے کچھ سنا ہی نہیں''۔

''اس وقت میں بہت پریشان تھے۔ کچھ گھر میں ہو تو دے آؤں''

''خود کیا جاؤ گے، تمھاری طبیعت آپ اچھی نہیں ہے بھجوا دو''۔

''بتاؤ تو''۔

''ہے تو کیا، دھان چاول سب ختم ہو رہا ہے۔ تم نے تو کتنا بیچ ڈالا۔ تھوڑا سا ہوگا، مٹکے میں رکھا ہے۔ اچھا اُٹھ کے نکال دیتی ہوں''۔

''نہیں ہم خود نکال لیں گے، تم تو ہم سے بھی کمزور ہو''۔

یہ کہہ کے جمعدار صاحب مٹکے کے پاس گئے، اس میں چار پانچ سیر چاول تھے، ایک ٹوکری میں آدھا نکال لیا۔ چپکے سے دوا کی شیشی بھی اٹھالی۔ اس طرح کہ بی بی جان کو کچھ خبر نہ ہو اور گیدو کی ماں کے گھر گئے۔ گیدو کی ماں پڑی کراہ رہی تھی۔ جمعدار صاحب کو دیکھ کے وہ گڑبڑا کے اٹھنے لگی۔ جمعدار صاحب نے بہت منع کیا مگر وہ کسی نہ کسی طرح اُٹھ ہی گئی۔

جمعدار صاحب نے پہلے ایک خوراک دوا پلائی پھر چاول دیا اور شیشی اس کے پاس چھوڑ کے چلے آئے۔ واپسی میں انھیں خیال آیا کہ اسے دوا کون پلائے گا، چاول وہ کیسے پکائے گی، انھیں چاند شیخ کی بیوہ کا خیال آیا، اس کے ہاں گئے۔ وہ جمعدار صاحب کو دیکھ کے ان کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی، جمعدار صاحب نے کہا ''ہاجرہ بی بی گیدو کی ماں بہت بیمار ہے، بیچاری کا کوئی دیکھنے والا نہیں، تم

نہ ہو، کچھ دن اس کے پاس رہو، اس کی دیکھ بھال کرو خدا تمھیں اس کا نیک بدلہ دے گا ہم سے بھی جو ہو سکے گا تمھاری مدد کریں گے۔ لو یہ ایک روپیہ۔''

ہاجرہ جمعدار صاحب کے نرم لہجے سے پسیج گئی اور وہ اسے گیدو کی ماں کے پاس پہنچا آئے۔ گھر واپس آئے تو بی بی جان کو بدستور بخار تھا، اور وہ بے چین سی تھیں۔ جمعدار صاحب نے انھیں پانی پلایا اور باوجود سخت منع کرنے کے ان کا سر بھی دھلایا۔

بی بی جان نے کہا ''مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ تم میری اس طرح خدمت کرو۔ گیدو کی ماں کی تو طبیعت خراب ہے، ہاجرہ ہی کو بلا دو۔''

جمعدار صاحب نے کہا ''میں تمھارے کام نہ آؤں گا تو کون آئے گا۔'' بی بی جان ''بس رہنے دو ہاجرہ کو بلا دو۔'' ''نہیں اسے کیا بلاؤں، اچھا نہیں لگتا۔''

''آخر کیوں''۔ جمعدار صاحب نے کچھ جواب نہ دیا، ان کے اندر کسی نئی چیز نے انھیں یہ کہنے سے روک دیا کہ وہ ہاجرہ کو گیدو کی ماں کی خدمت کے لیے چھوڑ آئے ہیں۔

(اقتباس)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے جواب دیں۔

ا۔ بی بی جان نے جب یہ کہا کہ گیدو کی ماں کے پاس کچھ کھانے کو نہیں کچھ بھجوا دو تو جمعدار نے کیا جواب دیا؟

ب۔ مولانا مستنصر باللہ کے پاس جو بزرگ بیٹھے تھے، وہ کون تھے؟

ج۔ جلو دھر اور مخلص کس مقصد کے لیے اچھے کام کرتے تھے؟

د۔ جمعدار صاحب نے گیدو کی ماں کی تیمارداری کے لیے کس کو بھیجا تھا؟

۲۔ پیر صاحب، کے کردار میں ناصح کی حیثیت سے کیا کیا خوبیاں پائی جاتی ہیں؟ مختصر بیان کیجیے۔

۳۔ پیر صاحب کی مدلل گفتگو سے جمعدار صاحب کے کردار میں کیا واضح تبدیلی رونما ہوئی؟ مختصر الفاظ میں بیان کیجیے۔

CAMPUS

سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل پیراگراف کی تشریح کیجیے۔

پیر صاحب: انھوں نے اچھا کام کیا، مسلمانوں کا سا.......... مسلمان بھائیوں نے برا کیا مسلمانوں کی شان کے خلاف''۔

جمعدار صاحب: ''مگر حضور.......... وہ لوگ تو بولتا ہے.......... روح کچھ نہیں.......... گناہ ثواب کچھ نہیں..........

اور پھر بھی اچھا کام کرتا ہے اور ہم.......... ہم لوگ سب کچھ بولتا ہے پھر اچھا کام نہیں کرتا؟

درج ذیل جملے میں علم بیان کی کون سی قسم کا استعمال ہوا ہے؟

'جمعدار صاحب کے دل ودماغ کی ڈوبتی ہوئی کشتی ابھر آئی۔ جیسے کسی نے مضبوط ہاتھوں سے کھینچ کر اسے کنارے

...یا ہو''۔

''آخر کیوں'' جمعدار صاحب نے کچھ جواب نہیں دیا۔ ان کے اندر کسی نئی چیز نے انھیں یہ کہنے سے روک دیا کہ وہ ہاجرہ

...یدو کی ماں کی خدمت کے لیے چھوڑ آئے ہیں''۔

جمعدار صاحب کو کس نئی چیز نے اپنی بیوی کو حقیقت بتانے سے روک دیا؟ وضاحت کیجیے۔

ناول کو افسانے سے ممیز کرنے کے لیے کوئی ایک خوبی یا صفت بیان کیجیے۔

CAMPUS

CAMPUS

(پیدائش.....۱۹۳۴ء)

عبداللہ حسین

عبداللہ حسین ۱۹۳۴ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ زمیندارہ کالج گجرات سے بی۔ اے کیا اور پھر کینیڈا سے کیمیکل انجینئرنگ کی ڈگری لی۔ کچھ عرصہ بیرون ملک ملازمت کی۔

عبداللہ حسین کے اوّلین ناول، اداس نسلیں (اوّلین اشاعت ۱۹۶۲ء) میں پہلی جنگ عظیم سے قیام پاکستان کے زمانے تک کی سیاسی جدوجہد کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول کی کہانی کا مقام مشرقی پنجاب ہے۔ ناول نگار نے اس علاقے کی دیہی زندگی پر اس کے اثرات کی نشان دہی کی ہے۔ افسانے میں سرمایہ داروں کے ہاتھوں غریب لوگوں کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے اور ہندوستان میں صنعتی نظام کی ابتداء اور ٹریڈیونین کی تحریک کے آغاز کا ذکر نہایت حقیقی انداز میں کیا ہے۔

ناول میں ایک خامی یہ ہے کہ اس میں بہت سے واقعات کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ جو پورے طور پر قصے کا جز نہیں بن پاتے اور یوں وحدت تاثر بری طرح مجروح ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ناول کی زبان و بیان پر بھی خاصے اعتراضات کیے گئے ہیں۔ کردار نگاری کے مقابلے میں واقعہ نگاری کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ ناول کی اٹھان ''آگ کے دریا'' جیسی ہے لیکن ناول نگار اسے آخر تک برقرار رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ تاہم ناول کی فضا عمدہ ہے۔ ڈاکٹر اسلم آزاد اس ضمن میں رقمطراز ہیں:۔

''عبداللہ حسین کے ہاں مختلف واقعات اور کرداروں کے متنوع تجربات کے سلسلے میں جو ماحول پیش کیا گیا ہے وہ یقیناً ناول نگار کی تخلیقی بصیرت و ذہانت کی حسین مثال ہے۔ واقعات سے متعلق فضا کی تشکیل میں عبداللہ حسین کے وسیع تجربات، باریک مشاہدات اور وسیع معلومات نیز ہر موقعے کی تصویر تیار کرنے اور ہم آہنگ ماحول کی تشکیل میں ان کی فن کارانہ صلاحیت نے بڑی ہنرمندی دکھائی ہے''۔

اہم تصانیف:

''اداس نسلیں''۔ ''واپسی کا سفر''۔ ''باگھ''۔ ''نشیب'' (افسانوی مجموعہ)''۔ ''اداس نسلیں'' آدم جی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

CAMPUS

(عبداللہ حسین)

نادار لوگ

تین چار سال قبل اعجاز نے کھرلوں کے بیاہ کے موقعہ پر ایک اچھے سوتی کپڑے کی شیروانی سلوائی تھی جو اس نے ایک آدھ حیثیت بخشی تھی۔ اعجاز کے خیال میں ہر اچھے موقع کے لیے یہ ایک موزوں لباس تھا۔ مگر سکینہ اور چاچا احمد اُس سے اختلاف کر رہے تھے۔

"بڑے بڑے جرنیل کرنیل آئیں گے" چاچا احمد کہہ رہا تھا "پُرانی اچکن پہن کر جانا درست نہیں۔"

"ابا ٹھیک کہتا ہے" سکینہ نے کہا "کوئی پیسوں کی کمی ہے؟"

"سرفراز فوج کا افسر بن رہا ہے۔ تُو اس کے باپ کی جگہ پر جا رہا ہے" چاچے احمد نے کہا۔ "عزت کا مامله ہے" سکینہ نے [illegible] خرچ اخراجات کی ایسے موکوں☆ پر پروا نہیں ہوتی۔ پیسے اور جدادیں کس کام کی اگر موکے محل پر خرچ نہ کی جائیں۔" اعجاز چپ [illegible] سارے وڈ وڈیرے کالی اچکن پہنتے ہیں۔ اُوپر مایا والی پگ کا شملا نکال کے جا۔ سرفراز ے کا سر بھی اونچا ہوگا۔ کالی اچکن [illegible] چاچے احمد نے کہا "پرانی مجھے دے دے۔ میرے اور بابے کے کام آئے گی۔"

"ابا تو تو چپ کر" سکینہ بولی، "پہلے کالی اچکن بنے تو پُرانی کا بھی دیکھا جائے گا۔ سب سے پہلے میرا حق پورا کرے۔ [illegible] میں ڈالتا جاتا ہے اور زمینیں دیکھتا رہتا ہے۔ یہ دیکھ" وہ اپنے باپ کے آگے باہیں پھیلا کر بولی "نہ گہنا نہ کپڑا۔ چار دفعہ کہہ چکی [illegible] برکا ہی بنوادے۔"

اعجاز مسکرایا۔ "اب تجھے منہ چھپانے کا خیال آیا ہے؟"

"منہ کون چھپاتا ہے" سکینہ بولی "نکاب تو اُلٹا ہی رہتا ہے۔ چھپنے چھپانے کی بات نہیں عزت کی بات ہے۔ پہلے اور [illegible] جب اللہ عزت دیتا ہے تو بیبیاں برکا اور نوکر لے کر گھر سے نکلتی ہیں۔"

"اعجاز" چاچا احمد سوچ کر بولا "تو پینٹ کوٹ پہن کر کیوں نہیں جاتا؟ فوج کا رواج ہے۔ اُوپر خاکی ٹوپ لگا لینا ٹش نکل [illegible]

اعجاز ہنس پڑا۔ خاکی ٹوپ کا رواج ختم ہو گیا ہے چاچا۔

"تیرے اُوپر سج جائے گا" چاچا سنجیدگی سے بولا "تیرا رنگ بھی گورا ہے"۔

"کپڑوں کی طرف تو دھیان نہیں دیتا" سکینہ نے کہا۔

☆ [illegible] جیسے موکہ، مامله، نکاب کا املا مروجہ املا سے مختلف ہے یہ کرداروں کے لہجے کے مطابق ہے۔

''میرے کپڑوں کو کیا ہے'' اعجاز بولا ''سیدھے صاف ستھرے پہنتا ہوں۔ بس شو، شا نہیں کرتا۔ اوچھے لوگوں کا کام ہے۔''

''شو، شا کی بات نہیں'' چاچا احمد بولا۔''سرفراز کی عزت ہے۔ تیری بھی عزت ہے۔ تیری پزیشن اب کوئی ہلکی ہے؟''

اعجاز کی حیثیت اب بہت مضبوط ہو چکی تھی۔ میوے والا گڑ ہاتھوں ہاتھ بک رہا تھا۔ ایک سال کے اندر اس کی کھپت مقامی منڈی کی حدود پار کر چکی تھی۔ اعجاز نے بارہ ایکٹر زمین نقد پر بیچ اور مزید بارہ ایکٹر ٹھیکے پر حاصل کر کے دُوسرے سال ساری زمین میں کماد بویا تھا۔ اپنا بیلنا خرید لیا تھا اور زمین پر دو کمروں کا ڈیرہ بنا لیا تھا جہاں گل افروز خان کے علاوہ دو مستقل ملازم رہتے تھے اور گُڑ و میوے کا ذخیرہ بھی ہوتا تھا۔ چاچا احمد اُسے وافر مقدار میں خشک میوے ہندوستان سے منگوا کر سپلائی کر دیتا تھا جو اُسے بازار کی نسبت کافی سستے پڑتے تھے۔ اعجاز اب اپنی منڈی کے علاوہ دُوسرے شہروں کو اپنے گُڑ کی سپلائی کرتا تھا۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ شجاع آباد کی شناخت ''بدامی گُڑ'' کے حوالے سے ہوتی تھی۔ اس سے اگلے سال آمدنی اس حد تک گئی کہ آدھا مربع زمین نقد پر کرانے اور اُوپر خرچہ نکالنے کے بعد بھی اعجاز کے پاس بنک میں جمع کرانے کے لیے پیسے بچ رہے تھے۔ ان سب باتوں کے اعجاز کا دل اور دماغ صحیح جگہ پہ قائم تھے، نہ دل میں فتور آیا تھا نہ دماغ میں غرور۔ اُس کا دل اصل میں اپنے مزدوروں کے درمیان ہی رہا تھا۔ اُس کے دل میں بیٹھی ہوئی چند باتیں تھیں جو اُس کو لمحہ بھر کے لیے نہ بھولتی تھیں۔

گاؤں کی مصروفیات کے باوجود اعجاز تقریباً ہر روز وقت نکال کر شہر جاتا اور یونین کے کام کرتا تھا۔ وہاں پہ بھی اُسے کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ مشرقی شہر اور نواح کی چھوٹی بڑی مزدور تنظیموں کا باہمی ربط استوار ہونے میں کافی حد تک پیش رفت تھی، جس کا سہرا اعجاز کے سر تھا۔ لیبر فیڈریشن کے عہدے داروں کے ساتھ اُس کا تعلق واسطہ پیدا ہو گیا تھا اور اب وہ اندرون شہر اور شاہدرے بادامی باغ کے بڑے صنعتی علاقے تک مار کرنے کی فکر میں تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ تنظیم نے اُسے پورے کے علاقے میں ایک چھوٹا سا کمرہ مہیا کر دیا تھا، جسے وہ دفتر کے طور پر استعمال کرتا اور وہیں سے ضروری خط و کتابت کیا کرتا۔ اب اُسے ایک ''سیٹ'' میسر آ گئی تھی جسے وہ اپنی کاروباری ترقی سے بھی زیادہ بڑی کامیابی تصور کرتا تھا۔ ان حالات نے اُس کے کے اندر مزید لچک اور دنیاداری کا رویہ پیدا کر دیا تھا، یہاں تک کہ دو ایک بار وہ ملک جہانگیر کے مسئلوں کے بیچ اُس کے گھر بھی گیا تھا۔ مزید ڈیڑھ دو سال گزرنے کے بعد اعجاز دو مربع سے اُوپر کی اراضی کا ذاتی مالک بن چکا تھا اور جہانگیر اب خاص طور پر سیاسی حیثیت کے پیشِ نظر اعجاز کے ساتھ برابری کے درجے پہ سلوک کرنے لگا تھا۔ پھاگن میں جہانگیر کے بھتیجے کا بیاہ تھا۔ شرکت کے لیے اُس نے اعجاز کو بمعہ لفٹنٹ ملک سرفراز اعوان'' واہل وعیال دعوت نامہ بھیجا تھا۔

اب سکینہ نے ایک آخری وار کیا۔ ''بُرکے کے بغیر میں جھینگر کے گھر قدم بھی نہ رکھوں گی۔'' ''ٹھیک ہے'' اعجاز بولا ''تجھے دوں تو جائے گی؟''

سکینہ چپ رہی۔

''اب بول نا''اعجاز نے کہا''جائے گی؟''

''دیکھا جائے گا۔ پہلے بر کا اور چوڑیاں تو بنیں۔''

اعجاز ہنسا۔''اب آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہو۔ یہ چوڑیاں کدھر سے آگئیں؟''''اور کیا۔ میں کب تک موکا بموکا اماں سے مانگ کر بانہوں کو ڈھکتی رہوں؟ تمھیں تو زمینیں خریدنے اور اللہ مارے شہر کے بکھیڑوں سے ہی منٹ نہیں ملتا۔''

''چوڑیاں بھی آجائیں تو پھر؟''اعجاز نے شرارت سے پوچھا۔

''پھر کیا؟''

''پھر جائے گی؟''

''پھر دیکھا جائے گا۔ جھینگرا کوئی لاٹ صاحب ہے۔''

اعجاز ہنس پڑا۔''بہانے بنائے جا۔ کب تک بنائے گی۔''

''یہ میرے بہانے نہیں تمھارے ہیں، جیب کی گانٹھ نہ کھولنے کے بہانے۔''

اعجاز دھیان ہٹا کر مُنہ ہی مُنہ میں ہنستا رہا۔ حسن، چاچے احمد کے گلے میں باہیں ڈالے اُس کی پشت پہ سوار تھا۔

''اوئے حسنے''اعجاز نے آواز دی۔''ادھر آ''

حسن، چاچے کی پشت سے اُتر کر باپ کی گود میں آبیٹھا۔''نانے کو کیوں تنگ کرتا ہے؟''اعجاز نے کہا۔

''چاچا؟'' بچے نے پوچھا۔

''چاچا میرا ہے'' اعجاز نے اُس سے کہا۔''تیرا نانا ہے۔''

''نہیں'' بچہ بولا۔ ''چاچا''

''اوئے تیرا نانا ہے، بے وقوف۔''

اعجاز اسی طرح پیار سے اُس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ سکینہ نے اعجاز کا دھیان بٹا ہوا دیکھا تو چولہے میں جلتی ہوئی لکڑی کو ہلا کر چاچے کو اپنی جانب متوجہ کیا اور ہاتھ اور سر کے اشاروں سے اُسے اعجاز کے ساتھ بات کرنے کو کہا۔''اعجاز'' چاچا احمد بولا، ''رشتے کا معاملہ تھا۔ سکینہ نے بات کی ہوگی۔'' ''ہاں''اعجاز کچھ توقف سے بولا۔

''بات پکی ہو جائے تو دُرست ہے،'' چاچے نے کہا، ''لوگوں کی نظریں سنبھل جاتی ہیں۔''

''بات تو درست ہے چاچا''اعجاز نے کہا۔

''پھر زندگی کا کیا پتا ہے۔ آج ہے کل گئی۔ ایک یہ ذمہ داری نکل جائے تو میں آرام میں ہو جاؤں۔ تیری ماسی ہر وقت فکر کرتی ہے۔''

''درست کہتے ہو چاچا'' اعجاز سکون سے بولا، ''ذمہ داری تو ہوتی ہی ہے۔''

''اُوپر سے باسے کی فکر بھی ہے۔ اُس کا دِل نہ کھیتی میں لگتا ہے نہ کسی اور بات میں۔ میرے کام کا اُسے چسکا پڑ گیا ہے۔ غلطی میری ہی ہے۔ اب میں کہتا ہوں پُلس وُلس میں بھرتی ہو جائے تو ٹِک جائے گا اور بچا بھی رہے گا۔ تیرا بھی اثر رسوخ ہے، سرفراز بھی اب فوج کا افسر ہو گیا ہے''۔

''سارے کام آہستہ آہستہ ہو جائیں گے چاچا۔ ابھی تو سرفراز پورا افسر بھی نہیں بنا،'' اعجاز ہنس کر بولا۔

''واہ، فوج کے افسر کی بات کوئی موڑ نہیں سکتا۔ بس تیری بہن کی بات پکی ہو جائے تو میری گردن سے بوجھ اُتر جائے۔''

اعجاز کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر بولا، ''چاچا، جمیلہ میری بہن بھی ہے اور بیٹی بھی، میری مرضی کی بات ہو تو آج ہی پکی کر دوں۔ مگر سرفراز اب جوان ہے، کالج کا پڑھا ہوا ہے، اپنی مرضی کا مالک ہو گیا ہے۔ ایک بار اُس سے بات کر کے دیکھ لینے دو پھر سمجھو کہ بات پکی ہو گئی۔''

''مرضی تو جو ہو گی تیری ہو گی اعجاز۔ اِن باتوں کا اقرار بڑوں میں ہی ہوتا ہے۔'' چاچے احمد نے کہا، ''تیرا خیال ہے کہ ہندستان سے آنے کے بعد تیرا رشتہ ہوا تھا؟ نہیں۔ سکینہ اور تُو ابھی بچونگڑے تھے جب تیری بہشتن ماں نے اپنی بہن سے بات کر کے تیرا منگیوا پکا کر لیا تھا۔''

سکینہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُس نے تندہی سے چولہا صاف کرنا شروع کر دیا۔ ''وہ اور زمانہ تھا چاچا'' اعجاز ہنس کر بولا، ''اب وقت بدل گیا ہے۔''

''جیسے تیری مرضی'' چاچا احمد بولا، ''اپنی لڑکیاں اپنے گھروں میں ہی لگ جائیں تو بہتر ہے۔''

''اِس سے اچھی کیا بات ہے، چاچا'' اعجاز نے کہا۔

چند روز کے بعد جب سرفراز گھر آیا تو چاچے احمد کا سارا ٹبر ملنے کے لیے آیا۔ چاچے احمد اور ماسی نے اسے گلے لگا کر خوش آمدید کہا۔

''کیوں بئی سرفراز'' چاچے احمد نے پوچھا، ''اجاز تیرے پاس ہونے کے جلسے پر پہنچ گیا تھا نا'' ۔ ٹھیک ٹھاک تھا نا، کوئی اُٹھک بیٹھک میں غلطی تو نہیں کر گیا؟''

''نہیں چاچا، لالے کی بڑی شان تھی۔''

''اور شان بنائی کس نے تھی؟ یہ خدا کا بندہ تو وہ لٹھے کی اچکن پہن کر جا رہا تھا۔''

''چاچا لٹھے کی نہیں بڑے اچھے کپڑے کی ہے۔'' اعجاز اُس کی بات کاٹ کر بولا۔ چاچے احمد نے اعجاز کی بات کی جانب توجہ ... میں نے'' وہ چھاتی پہ ہاتھ مار کر بولا اور سکینہ نے اس کو کالی اچکن پہنائی۔''

''بالکل ٹھیک کیا چاچا'' سرفراز نے کہا۔ ''سب لوگ لالے کے شملے کو دیکھ رہے تھے۔'' ''وہ شملا بھی میں نے اِسے پہنایا تھا ... تیری عزت کی خاطر۔'' چاچے نے کہا، پھر دلچسپی سے سرفراز کی جانب جھک کر پوچھا، جرنیل کرنیل بھی دیکھ رہے تھے؟''
... لے کو دیکھ رہے تھے، سرفراز ہنس کر بولا۔

''دیکھ لے'' چاچا احمد فخریہ اعجاز سے مخاطب ہوا، ''میں نہ کہتا تھا ٹش نکال کے جا تو سرفراز کا سر اونچا ہوگا۔''

گاؤں کا ایک ایک آدمی سرفراز سے ملنے کے لیے آیا۔ دو دِن کے بعد جب فراغت کا لمحہ آیا تو اعجاز نے بات کی۔ سرفراز کا جواب سننے سے پہلے ہی اعجاز کو محسوس ہو چکا تھا کہ اب وقت واقعتاً بدل چکا تھا۔ سرفراز جو کبھی اُس کی بات کو نہ پلٹتا تھا، اب سمجھ اور سوچ ... اور حوصلے سے سر اُٹھا کر جواب دیتا تھا، جیسے اُس کے آگے دنیا جہاں کا وقت ہے اور دل میں جواب دہی کی کوئی بیتابی نہ ہو۔
... تو چھے سال تک میں شادی ہی نہیں کرسکتا، لالہ'' سرفراز نے کہا۔ ''کیوں؟''

''فوج کا قانون ہے۔ یا چھے سال کی سروس مکمل ہو یا چھبیس سال کی عُمر۔ اس سے پہلے نہ شادی کی اجازت ملتی ہے نہ میریڈ ... نہ الاؤنس۔''

''تجھے رہائش الاؤنس کی کیا ضرورت ہے۔'' اعجاز نے کہا، ''تیرا اپنا گھر ہے، پیسے دھیلے کا اللہ کا فضل ہے۔ سارا خرچہ میں ...''

''سارا خرچہ کرو گے؟'' سرفراز نے شرارت سے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں'' اعجاز نے جواب دیا۔

سرفراز کچھ بولے بغیر مسلسل مسکراتا ہوا اُسے دیکھتا رہا تو اعجاز کو اُس کا مطلب کھٹک گیا۔ ''دیکھ سرفراز'' وہ بولا، ''میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔ لوگ مجھے کنجوس آدمی سمجھتے ہیں۔ میں کنجوس نہیں ہوں، کفایت شعار ہوں۔ آج میں چند لفظوں میں تجھے اپنی ... سناتا ہوں۔''

اعجاز کی آواز ایک لمحے کو بھرا گئی۔ اُس نے کھانس کر گلا صاف کیا، اُٹھ کر ناک سنکی اور چادر کے پلو سے منہ پونچھا۔ ''میں نے غربت دیکھی۔ ٹھیک ہے۔ روٹی پیٹ میں جاتی رہی ہے، مگر فاقہ کشی سے بڑی غربت کی صورتیں ہوتی ہیں۔ میں نے ہجرت اور ماں کی موت ایک ساتھ دیکھی ہے۔ یہ غربت کا ایک بڑا مقام ہے۔ تو خوش قسمت ہے نہ ہجرت دیکھی نہ ماں کی خبر ہوئی۔ مزید خوش قسمت ہے

کہ تیرا اور پاکستان کا اکٹھا جنم ہوا، خوشیاں منائی گئیں۔ میری عمر میں ایک سے ایک کڑا امتحان آیا ہے۔ میں تجھے بتاتا ہوں سب سے بڑی غربت ذلت کی غربت ہوتی ہے۔ ناطاقتی کی غربت، زیادتی کے سامنے بے بضاعتی کی غربت، سمجھو کہ یہ غربت کا صدر مقام ہے۔ پیٹ کا خلا کبھی نہ کبھی بھر جاتا ہے۔ ذلت کے داغ مرتے دم تک سینے سے نہیں اُترتے۔ میں نے اپنے دِل سے وعدہ کیا تھا کہ دُنیا اِدھر کی اُدھر کرنی پڑے، مگر اب مجھے کوئی ذلیل نہیں کرے گا۔ تجھے پتا ہے، اب میں گھر بیٹھ کر کھا کھلا سکتا ہوں، مگر میں نے غریبوں مزدوروں کے ساتھ بیٹھنا نہیں چھوڑا، وہ میری عزت کا سبب ہیں۔ ساتھ اب جیب میں چار پیسے بھی آ گئے ہیں، اونچی جگہ ہو یا نیچی، برابری کا درجہ ملتا ہے۔ میں کنجوس نہیں ہوں، ذرا سوچ سمجھ کر گانٹھ کھولتا ہوں۔

جیب میں رقم ہو تو دل میں گرمی رہتی ہے۔ ایک منٹ صبر کرو، تمھیں دکھاتا ہوں'' اعجاز اُٹھ کر گھر کے اندر گیا اور چند منٹ کے بعد واپس آیا۔ اُس کے ہاتھ میں بنک کی کتاب پکڑی تھی ''یہ دیکھ''، وہ ورق اُلٹ کر دکھانے لگا پھر اُس نے آخری سطر پر انگلی رکھی، ''یہ رقم اِس وقت جمع ہے۔ اِس میں آدھی تیری ہے۔ جس وقت چاہو لے سکتے ہو۔ میرے نزدیک حسن حسین سے پہلے تیرا حق ہے۔''

''نہ نہ لالہ، یہ تیری کمائی ہے۔ ضرورت ہوئی تو مانگ کر لے لوں گا۔ مگر میں اپنے پیروں پہ کھڑا ہو چکا ہوں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ روپے پیسے کا اللہ کا فضل ہے تو پھر کچھ اپنے اوپر بھی خرچ کرو۔ گھر باہر کی حالت درست کرو۔''

''گھر باہر کی حالت کو کیا ہے؟ ٹھیک ٹھاک ہے۔''

''کہاں ٹھیک ٹھاک ہے؟ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے اُسی کچے مکان میں رہ رہے ہیں جو ابّے نے بنایا تھا۔ آج تک صحن میں اینٹیں تک نہیں لگوائیں۔ بارش ہوتی ہے تو کیچڑ کی وجہ سے قدم نہیں اُٹھتا۔ مکان پکا کرواؤ، اُوپر چوبارہ بنواؤ، باہر والا کمرہ گرا کر نیا بنواؤ، دروازے کھڑکیاں نئی لگواؤ، روغن سفیدی کراؤ، کچھ پتا بھی چلے کہ اللہ کا فضل ہے۔ خالی کہنے سے کیا ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اعجاز نے کہا۔ ''اِینٹیں لگوادوں گا۔''

''اونہوں۔ سارا مکان پکا بنواؤ۔ تم کہتے ہو آدھے پیسے میرے ہیں۔ میرے حصے کے سارے لگا دو۔''

''تیرے پیسے کو میں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ اپنے پیسے سے سب کچھ بناؤں گا۔''

''چلو جیسے بھی بناؤ، بناؤ تو سہی۔''

''بنادوں گا، کرنیل صاحب۔ بنوادوں گا۔''

سکینہ چہرے پہ مسکراہٹ لیے پُرتحسین نظروں سے سرفراز کو دیکھ رہی تھی۔

''سرفراز ٹھیک ہی کہتا ہے،'' وہ بولی۔ ''آئے گئے کی نظروں میں بھی عزت ہوتی ہے۔ تلک برادری والے آتے جاتے رہتے ہیں۔''

"اب تو نے چوڑیوں کے بعد مکان پر بھی سرفراز سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے؟" اعجاز نے کہا "کیوں نہیں؟ سب کچھ بنا سکتے ہو۔ ...سرفراز کی بیوی کے لیے بھی کڑے اور ہار بناؤں گی۔"

"بی بی، پہلے مجھے سرفراز سے کہنا تو چھوڑو"۔ "تو کیا اب تجھے لفٹین صاحب کہوں؟"

"نہیں،" سرفراز ہنسا۔ "سرفراز کہو۔ اور شادی کا ذکر چھے سال سے پہلے نہ کرو۔"

مشق

ا۔ سبق "نادار لوگ" کے مرکزی کردار کا نام بتائیں۔

ب۔ فوج میں کسی افسر کی شادی کے لیے ملازمت اور عمر کی کم سے کم حد کیا ہے؟

ج۔ برقع کی بات پر جب اعجاز نے اپنی بیوی سے کہا کہ "اب تجھے منہ چھپانے کا خیال آیا ہے" تو اس کی بیوی نے کیا جواب دیا؟

د۔ چاچا احمد، اعجاز سے کس کے رشتے کی بات کرنا چاہتا تھا؟

'نادار لوگ' کے کرداروں کے نام لکھیے اور مرکزی کردار کی ایک خاص خوبی قلمبند کیجیے۔

اعجاز کے ماضی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

'نادار لوگ' کے مصنف کے حالات زندگی پر مختصر نوٹ لکھیں۔

نصاب میں شامل سبق 'نادار لوگ' کا خلاصہ لکھیے۔

درج ذیل پیراگراف کا اِملا درست کیجیے۔

"سرفراز فوج کا افسر بن رہاہے۔ تو اس کے باپ کی جگہ پر جار ہاہے"۔ چاچے احمد نے کہا۔ "عزت کا ماملہ ہے" سکینہ نے کہا "خرچ اخراجات کی ایسے موکوں پر پروانہیں ہوتی پیسے اور جدادیں کس کام کی اگر موکے محل پر خرچ نہ کی جائیں"۔

دل میں فتور آنا' محاورہ ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کی وضاحت کرتے ہوئے اسے جملے میں اس طرح استعمال کیجیے کہ مطلب ...ے۔ نیز سبق میں سے تین مزید محاورات چن کر ان کا مطلب بیان کیجیے۔

"یہ دیکھ" وہ ورق الٹ کر دکھانے لگا پھر اس نے آخری سطر پر انگلی رکھی "یہ رقم اس وقت جمع ہے۔ اس میں آدھی تیری ہے ... لے سکتے ہو۔ میرے نزدیک حسن حسین سے پہلے تیرا حق ہے"۔ اس جملے کا مفہوم واضح کیجیے۔

"بانس بریلی کو" ایک ضرب المثل ہے اور "نیبو نچوڑ" تلمیح۔ دونوں کا پسِ منظر واضح کیجیے نیز تلمیح کی تعریف کیجیے۔

... میں عموماً ایک بری عادت ہوتی ہے کہ کسی کا نام بگاڑ کر پکارتے ہیں۔ آپ سبق ہذا سے اس قسم کی کوئی مثال پیش کیجیے۔

(پ۔۱۹۲۳ء)

شوکت صدیقی

شوکت صدیقی ۲۰ مارچ ۱۹۲۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے ۱۹۴۶ء میں ایم۔اے سیاسیات کیا۔ ۱۹۵۰ء میں وہ لاہور آئے لیکن بعد میں مستقلاً کراچی میں سکونت پذیر ہوئے۔

انھیں ادبی ذوق قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا چنانچہ شوکت صدیقی کا رجحان شروع ہی سے ادب کی طرف تھا۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ افسانوں کے پہلے مجموعے ہی نے انھیں کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے میدانِ صحافت میں قدم رکھا۔ انھوں نے مختلف اخبارات میں کام کیا جن میں ''ٹائمز آف کراچی''، ''مارننگ''، ''مشرق'' اور ''مساوات'' کے نام قابل ذکر ہیں۔ روزنامہ ''مشرق'' میں انھوں نے کالم نویسی بھی کی۔ ۱۹۵۹ء میں وہ پاکستان رائٹرز گلڈ کی مجلس عاملہ کے ممبر بنے۔ اسی سال انھیں ''پروگریسو رائٹرز موومنٹ'' کا صدر بھی بنایا گیا۔

افسانہ نگاری، فنِ صحافت اور کالم نویسی کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ پائے کے ناول نگار بھی ہیں۔ یوں تو انھوں نے تین ناول لکھے اور تینوں ہی اردو کے عمدہ ناول ہیں مگر ان کی وجہِ شہرت ان کا ناول ''خدا کی بستی'' بنا بلکہ قارئین تو بالعموم انھیں اسی کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔

ان کی تصانیف میں ''تیسرا آدمی''، ''اندھیرا اور اندھیرا''، ''خدا کی بستی''، ''کیمیا گر''، ''جانگلوس'' اور ''چار دیواری'' شامل ہیں۔ شوکت صدیقی کو ۱۹۹۷ء میں ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ''تمغہ حسن کارکردگی'' ملا۔

شوکت صدیقی کی تحریروں کی کامیابی کا راز حقیقت پسندی ہے۔ وہ معاشرے کے حقائق اور مسائل کو اپنی تحریروں کا موضوع بناتے ہیں۔ زبان و بیان کے حوالے سے وہ نہایت سلجھی ہوئی زبان استعمال کرتے ہیں جس میں ان کی جائے پیدائش لکھنؤ کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ شوکت صدیقی کی کردار نگاری بھی قابل ذکر ہے۔ ان کے کردار معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں جو جامد اور مثالی نہیں بلکہ ان میں حقیقی زندگی کے تمام رنگ ملتے ہیں۔ یہ کردار ہم اپنے اردگرد چلتے پھرتے دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی بہترین مثالیں ''خدا کی بستی'' اور ''جانگلوس'' کے کردار ہیں۔ ان کے ہاں مکالمہ نگاری، جذبات نگاری اور منظر کشی کے بہترین مرقعے ملتے ہیں۔ شاملِ نصاب اقتباس ان کے مقبول ترین ناول ''خدا کی بستی'' سے لیا گیا ہے۔

خدا کی بستی

ستمبر کی ایک دھندلی صبح کو سلمان چپ چاپ اپنے گھر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بوسیدہ اٹیچی کیس لٹک رہا تھا۔ لباس میلا تھا اور سر کے خشک بال بکھرے ہوئے تھے۔

اس کی آمد پر نہ کوئی ہلچل پیدا ہوئی اور نہ ہی کسی نے توجہ دی۔ گھر کا ہر فرد سرد مہری سے پیش آیا۔ باپ نے تو بات تک کرنا گوارا نہ کی۔ البتہ ماں کی مامتا بلک اٹھی۔ وہ اسے سینے سے لگا کر دیر تک روتی رہی۔ چند لمحے اس کے چاروں طرف ہجوم رہا، پھر ہر شخص خاموشی سے اپنے کام کاج میں مصروف ہو گیا۔

سلمان نے غور کیا کہ اس کی غیر حاضری میں گھر میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ باپ ملازمت سے ریٹائر[1] ہو کر پنشن[2] پا گیا تھا۔ اس نے لمبی داڑھی رکھ لی تھی۔ وہ بڑی پابندی سے پانچوں وقت نماز پڑھتا، کلام پاک کی تلاوت کرتا اور رات کو تہجد بھی پڑھتا۔ خاموش بیٹھا حقہ گڑگڑایا کرتا اور دینی کتابوں کا مطالعہ کرتا۔

باپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اطمینانِ قلب حاصل ہے۔ اسے فخر تھا کہ اس نے ۳۶ سال تک بڑی خوش اسلوبی سے سرکاری ملازمت کی اور دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دیے۔ ہمیشہ افسرانِ بالا کو خوش رکھا۔ اس کا ریکارڈ صاف ستھرا رہا۔ اسے تین سو روپے ماہانہ پنشن مل رہی تھی۔ مزے سے گزر رہی تھی۔ اس نے اپنی تمام اولادوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اچھی زندگی گزار سکتے تھے۔ اسے دکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ اس کا بیٹا سلمان نالائق رہ گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سلمان نائب تحصیلدار نہیں تو کم از کم سب انسپکٹر پولیس ہی بن جاتا۔

ماں اپنی عمر سے زیادہ بوڑھی لگتی تھی۔ اس کے مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا تھا۔ وہ بات بات پر رونا پیٹنا شروع کر دیتی۔ کبھی گھر پر اس کی حکمرانی تھی مگر اب کاٹھ کباڑ کی طرح ناکارہ قرار دے کر گھر کے ایک کونے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ ایک کوٹھڑی نما مختصر کمرے میں پڑی کھانسا کرتی، پان چبایا کرتی اور چھالیا کترا کرتی۔ وہ اپنی اولاد کو سرکش اور بدتمیز سمجھتی تھی اور اولاد اسے جاہل اور ضدی قرار دیتی تھی۔ گھر میں جب کوئی مہمان آتا تو اس کے کمرے میں باہر سے تالا لگا دیا جاتا۔ اس لیے کہ وہ بڑی بے سروپا باتیں کرتی تھی۔ اس کے لہجے سے نفاست اور شائستگی کے بجائے پھوہڑپن ٹپکتا تھا۔ وہ باتوں کی دھن میں اکثر ایسی باتیں کہہ جاتی جو چھپانے کی تھیں اور جن سے گھر کے وہ راز افشا ہو جاتے جن کو سات پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جاتی تھی لیکن یہی ایک ایسا

وقت ہوتا جب وہ اپنی اولاد سے انتقام لے سکتی تھی۔

جب بھی گھر میں مہمان آتے تو اکثر یہی ڈراما ہوتا۔ کبھی ایسا وقت بھی ہوتا کہ مہمانوں کی آمد سے قبل ماں کے ڈھیروں مکھن لگایا جاتا۔ سو سو طرح سے اس کی خوشامد ہوتی، بار بار ہدائتیں دی جاتیں اور منت سماجت کر کے اسے کمرے میں بند کر دیا جاتا مگر یہ اس کی مرضی پر منحصر تھا، اس لیے کہ وہ کمرے کے اندر سے بھی شور مچا سکتی تھی اور اس کا یہ اقدام بہت ہی خطرناک ہوتا تھا۔

ماں کو سب سے زیادہ شکایت اپنی چھوٹی بیٹی سے تھی جس کے سپرد ان دنوں خانہ داری کا سارا انتظام وانصرام تھا۔ یہ ذمہ داری سنبھال کر اس نے ماں کے حق پر ڈاکا ڈالا تھا جسے وہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس حق سے محروم ہونے کے بعد اس کی حیثیت گھر میں ملازموں سے بدتر ہو گئی تھی۔

سلمان کی بڑی بہن لاہور کے کسی کالج میں لیکچرار تھی۔ اس نے فلسفے میں ایم اے کیا تھا لیکن وہ خود ایک ہی فلسفے میں یقین رکھتی تھی اور وہ فلسفہ یہ تھا کہ کسی گزیٹڈ آفیسر سے شادی ہو جائے۔ اسی انتظار میں اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ گزیٹڈ آفیسر شوہر سے مایوس ہو کر اب وہ غیر ملکی سکالرشپ کے لیے کوشاں تھی۔ ان دنوں اس کے سر پر یہی دھن سوار تھی۔

منجھلا بھائی نہر کے محکمے میں ملازم تھا۔ وہ سراپا تصنع تھا۔ اس پر مغربیت دیوانگی کی حد تک سوار تھی۔ اس کی بیوی گریجویٹ تھی۔ لہٰذا وہ اور بھی زیادہ انگریز بنتا جا رہا تھا۔ وہ سویرے اٹھ کر بیڈٹی [1] پیتا، ناشتے کے ساتھ اخبار کا مطالعہ کرتا۔ وہ گھر میں روزانہ نت نئی تبدیلیاں کرتا رہتا۔ ایک روز پیتل کی ایک گھنٹی لے آیا جو کھانے کی میز پر رکھ دی گئی۔ ناشتے اور کھانے کے وقت اسے بجا کر باقاعدہ اعلان کیا جاتا۔ وہ اپنے بچوں سے ہمیشہ انگریزی میں بات چیت کرتا۔ وہ کوئی بڑا عہدے دار نہیں تھا۔ آمدنی کم تھی اور اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔ جنھیں پورا کرنے کے لیے وہ رشوت خوری کے نت نئے طریقے ایجاد کرتا تھا۔ اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ اسے بڑا آدمی سمجھا جائے۔

چھوٹا بھائی بی۔ اے کر چکا تھا۔ وہ تمام وقت پڑھنے میں جتا رہا۔ اس کی زندگی کا ایک ہی مشن تھا کہ کسی طرح سی ایس پی بن جائے۔ شاندار بنگلہ، چمکتی کار، ''اردلی'' اور ''سر'' کہنے والے ماتحتوں کی پلٹن [2]۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنی بینائی خراب کر چکا تھا۔ وہ موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگاتا تھا۔

سلمان کئی برس بعد آیا تھا اور ان کئی برسوں میں اتنی بہت تبدیلیاں آ چکی تھیں کہ وہ اپنے ہی گھر میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔ سلمان اس لیے گھر آیا تھا کہ اس کی صحت کچھ سنبھل جائے گی اور جس ذہنی انتشار میں مبتلا تھا اس میں کمی آ جائے گی مگر ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ٹائی فائیڈ میں مبتلا ہو گیا۔ ایسا بیمار پڑا کہ ہفتوں بستر پر پڑا رہا۔ یہ اس کی زندگی کا اذیت ناک دور تھا۔ اس کے بھائی بہنوں

1- Bed Tea

2- اصل انگریزی لفظ ''پلاٹون'' ہے۔ جس کی اردو شکل ''پلٹن'' ہے۔

بڑا ہی افسوس ناک تھا۔ کوئی اس کے قریب آ کر نہ پھٹکتا۔ وہ اس سے اس طرح کتراتے جیسے وہ مجسم ٹائی فائیڈ کی بلا بن گیا تھا جو قریب آتے ہی ان سے چمٹ جاتی۔

سب مل کر قہقہے لگاتے، فلموں پر تبصرے کرتے، لباسوں کے نئے ڈیزائنوں پر بحث کرتے مگر کوئی اس کی علالت کے متعلق بات بھی نہ کرتا۔ چھوٹا بھائی سلمان کے لیے صرف ایک بار ڈاکٹر کے پاس گیا تھا اور واپس آ کر اس قدر احسان جتایا تھا کہ وہ دوبارہ اس سے کچھ نہ کہہ سکا۔ بڑی بہن کبھی کبھار بھولے بھٹکے اس کی طرف آ جاتی۔ کھڑے کھڑے اشاروں سے اس کی طبیعت کا حال پوچھتی اور الٹے قدموں واپس چلی جاتی۔

ایک ماں کی مامتا تھی جو ہر وقت بے چین رہتی۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھی رہتی اور اکثر ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وقت پر دوا دیتی، اس کا سر دباتی، بخار کی شدت ہوتی تو اس کے تلوے سہلاتی۔ پیشانی پر کپڑا بھگو کر رکھتی۔ ہر طرح اسے تسلی دیتی۔ کبھی کبھی وہ اپنی بے کسی پر بے قرار ہو کر آبدیدہ ہو جاتا تو وہ اسے سمجھاتی اور سمجھاتے سمجھاتے خود بھی رونے لگتی۔

مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ گھر کے سارے اخراجات قرض پر چل رہے تھے۔ سلمان کے لیے دوا بھی قرض پر آ رہی تھی۔ وہ موسمی کا رس پینا چاہتا تھا۔ طویل علالت نے اسے بچوں کی طرح ضدی بنا دیا تھا۔ وہ ماں سے بار بار موسمیاں منگوانے کے لیے اصرار کرتا تھا۔ ماں تو پہلے ٹالتی رہی، پھر اپنی مجبوری پر رو پڑی اور آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔ سلمان کو اپنی غلطی کا اچانک شدت کے ساتھ احساس ہوا۔

لیٹے لیٹے سلمان کی نظر منجھلے بھائی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس نے دیکھا کہ کمرے میں میز پر بہت سے تازہ پھل رکھے تھے اور اس کا بھائی اونچی آواز سے بول رہا تھا۔ وہ بیوی کے ساتھ اپنے ایک بیمار افسر کی عیادت کے لیے اسپتال جا رہا تھا اور یہ پھل جن میں سرخ سرخ موسمیاں بھی شامل تھیں اسے پیش کرنے کے لیے بطور خاص منگوائے گئے تھے۔ سلمان نے سب کچھ خاموش نگاہوں سے دیکھا اور کسی اندرونی چوٹ سے بلبلا کر رہ گیا۔

باپ فجر کی نماز مسجد میں پڑھتا تھا۔ واپسی پر سلمان کے کمرے میں بھی آتا۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ جھک کر سلمان کی پیشانی چھوتا۔ کلائی تھام کر نبض دیکھتا مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالتا۔ اس کے سرہانے کھڑا زیر لب کوئی دعا پڑھتا رہتا۔ جب وہ آتا، سلمان کی آنکھ کھل جاتی۔ اس وقت اسے اپنے باپ کے چہرے پر ایک مقدس نور نظر آتا۔ اس کی سفید ڈاڑھی آہستہ آہستہ حرکت کرتی اور آنکھوں میں بے بسی اور مظلومیت جھلکتی۔

سلمان خاموش لیٹا سوچتا رہتا کہ یہ بوڑھا کس قدر بدقسمت ہے۔ اس نے اپنی ساری جوانی موٹی موٹی فائلوں میں

سر کھپاتے گزار دی۔ افسران کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دس دس بارہ بارہ گھنٹے دفتر میں کاٹتے۔ ہمیشہ موٹا جھوٹا پیا اور روکھا سوکھا کھایا۔ اس نے زائد سے زائد مشقت کی، کم سے کم خرچ اور زائد سے زائد پس انداز کیا اور یہ سب کچھ اس نے صرف اس لیے کیا کہ اس کی اولاد کا مستقبل روشن ہو جائے۔

وہ ہزاروں روپے جو اس نے اپنی خوشیاں نیلام کر کے کمائے تھے، اولاد کی تعلیم پر لگا دیے۔ اس کی تعلیم یافتہ اولاد اور اَن پڑھ نیاز میں کوئی فرق نہیں تھا۔ سلمان سوچا کرتا کہ اس سے زیادہ سمجھ دار تو نیاز کا باپ تھا جس نے اسے کوئی تعلیم نہیں دلائی۔ اپنی گاڑھی کمائی کا ایک پیسہ اس پر صرف نہیں کیا۔ نیاز کو بھی اس سم سم کی تلاش تھی جس کی تلاش میں اس کے بہن بھائی سرگرداں تھے لیکن نیاز نے اس سم سم کا سراغ لگا لیا تھا۔ ان پڑھ کباڑیا تین گریجویٹوں سے بازی لے گیا۔ کوٹھی، کار اور بینک بیلنس جیت کے تین کارڈ اس کے پاس تھے۔ وہ بڑا آدمی بن چکا تھا اور وہ تینوں ابھی تک جیت کے ان تینوں کارڈوں کے خواب ہی دیکھ رہے تھے۔

سلمان کو نیاز سے نفرت تھی اور اپنے بہن بھائیوں سے بھی۔ نیاز نے اسے اس لیے نظرِ حقارت سے دیکھا تھا کہ وہ قیمتی سگریٹ نہیں پی رہا تھا، شاندار سوٹ نہیں پہنے تھا، اس کے پاس کار نہیں تھی۔ وہ مفلوک الحال انسانوں کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ ان کی زندگی سنوارنا چاہتا تھا اور اس کے بہن بھائی اس لیے اسے حقیر اور کم تر سمجھتے تھے کہ اس نے کوئی عہدہ، کوئی منصب، ہتھیانے کی کوشش نہیں کی۔ بینک بیلنس کیوں نہ بڑھایا؟ ان کے نزدیک عوام کی خدمت محض مسخرا پن تھا۔ سراسر حماقت تھی اس لیے کہ وہ بلندی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انھیں مطلق احساس نہ تھا کہ نیچے کروڑوں ننگے بھوکے، کیڑے مکوڑوں کی مانند رینگ رہے ہیں جو ان ہی کی طرح انسان ہیں جن کی خوشیاں اور غم ان سے مختلف نہیں ہیں۔ وہ اپنی تحقیر اور ذلت کا ان سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔

صحت یاب ہونے کے بعد سلمان کی ماں نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ وہ شادی کرے۔ ماں کی خواہش تھی کہ اس کی زندگی ہی میں وہ اپنا گھر بسا لے۔ یہ پروگرام دراصل اس کے باپ کا تھا اور بیوی کے ذریعے سے اس نے سلمان تک پہنچایا تھا۔ متوسط طبقے کے ایک عام باپ کی طرح اسے بھی سلمان کو راہ راست پر لانے کا ایک ہی مجرب نسخہ سمجھ میں آیا اور وہ شادی کا پروگرام تھا۔

سلمان نے صاف انکار کر دیا۔ مگر جب ماں نے بتایا کہ لڑکی کا چچا صوبائی اسمبلی کا ممبر ہے، باپ کا انتقال ہو چکا ہے، چچا نے اولاد کی طرح اسے پالا پوسا ہے وہ پانچ ہزار روپیہ نقد دے گا اور اس کے علاوہ ملازمت بھی دلوا دے گا تو یہ سن کر سلمان کو سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔

چند روز تک سوچ بچار کرنے کے بعد وہ شادی پر رضامند ہو گیا۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔

سلمان کو اندازہ ہو گیا کہ اس کی بیوی سیدھی سادی گھریلو لڑکی ہے۔ اس نے میٹرک تک تعلیم پائی تھی۔ اس کا ذہن گویا گیلی مٹی تھا جسے وہ کمہار کی طرح جس سانچے میں چاہتا ڈھال سکتا تھا۔

وہ اس کی توقع سے زیادہ دلکش اور معصوم نکلی۔ وہ خوش تھا کہ اس نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ جہیز کے علاوہ پانچ ہزار نقد ملے تھے۔ ملازمت کے لیے چچا نے حسب وعدہ کوشش شروع کر دی تھی۔ شادی کے تیسرے ہی ہفتے ملازمت کا بندوبست ہو گیا۔ سلمان نے بیوی کو گھر پر چھوڑا اور اسی روز پہلی ٹرین سے کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔

(خدا کی بستی)

مشق

۱۔ **مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب دیں۔**

ا۔ سلمان کی آمد پر گھر والوں نے کس تاثر کا اظہار کیا؟

ب۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سلمان کے باپ کی مصروفیات کیا تھیں؟

ج۔ سلمان کے باپ کو کس بات پر فخر تھا؟

د۔ سلمان کی ماں کی گھر میں اب کیا حیثیت تھی؟

ہ۔ ماں کو سب سے زیادہ شکایت کس سے تھی؟

۲۔ **درست بیان کے سامنے (√) اور غلط بیان کے سامنے (x) کا نشان لگائیں۔**

ا۔ ''خدا کی بستی'' کے مصنف کا نام شوکت صدیقی ہے۔

ب۔ ''خدا کی بستی'' ایک افسانہ ہے۔

ج۔ شوکت صدیقی نے شاعری بھی کی۔

د۔ شوکت صدیقی کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔

ہ۔ شوکت صدیقی مستقل طور پر لاہور میں آباد ہوئے۔

۳۔ **سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔**

ا۔ اسی انتظار میں اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔

ب۔ ایک ماں کی مامتا تھی جو ہر وقت بے چین رہتی۔

ج۔ اس کے بہن بھائی اس لیے اسے حقیر اور کم تر سمجھتے تھے کہ اس نے کوئی عہدہ، کوئی منصب ہتھیانے کی کوشش نہیں کی۔

د۔ اس کی آمد پر نہ کوئی ہلچل ہوئی اور نہ ہی کسی نے توجہ دی۔

ہ۔ کبھی اس گھر پر اس کی حکمرانی تھی مگر اب کاٹھ کباڑ کی طرح ناکارہ قرار دے کر ایک کونے میں بٹھا دیا گیا تھا۔

۴۔ سبق کے حوالے سے خالی جگہیں پر کریں۔

ا۔ وہ اپنی.................کو سرکش اور بدتمیز سمجھتی تھی۔

ب۔ جب گھر میں.................آتے تو اکثر یہی ڈراما ہوتا۔

ج۔ سلمان کی بڑی.................لاہور کے کسی کالج میں لیکچرار تھی۔

د۔ ان دنوں اس کے.................پر یہی دھن سوار تھی۔

ہ۔ اس کی صرف ایک خواہش تھی کہ اسے.................آدمی سمجھا جائے۔

۵۔ مصنف نے سلمان کی زندگی کے اس دور کو اذیت ناک قرار دیا ہے۔ کیوں؟ وضاحت سے لکھیں۔

۶۔ ''خدا کی بستی'' کا جو اقتباس آپ نے پڑھا ہے اس کا خلاصہ لکھیں۔

۷۔ ''خدا کی بستی'' کے حوالے سے شوکت صدیقی کے اسلوب تحریر پر نوٹ لکھیں۔

۸۔ ''خدا کی بستی'' میں ماں باپ کا جو کردار نظر آتا ہے، اپنے الفاظ میں لکھیں۔

CAMPUS
CAMPUS
CAMPUS